اداریہ

نائب مدیر

پیغام سیرت

اسوۂ حسنہ اور حسن اعتدال

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم، اما بعد

انسانی زندگی عناصر کے اعتدال کا نام ہے۔ اسی اعتدال سے نظام عالم قائم ہے۔ اللہ تعالیٰ کے تمام تکوینی امور میں توازن و اعتدال کی کارفرمائی مکمل طور پر نظر آتی ہے، یعنی اس کے برخلاف کوئی صورت ممکن ہی نہیں۔ قرآن حکیم نے اس جانب بار بار متوجہ کیا ہے، اور اپنے خاص اسلوب میں، یعنی مثالیں دے کر اور انداز بدل بدل کر۔ ایک مقام پر تو بہت واضح الفاظ میں فرمایا:

مَاتَرٰی فِی خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ط فَارْجِعِ الْبَصَرَ لا هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ O ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ O (۱)

کیا تو رحمٰن کی تخلیق میں کوئی فرق دیکھتا ہے، سو پھر نگاہ ڈال کر دیکھ کیا تجھے کوئی خلل نظر آتا ہے۔ پھر بار بار نگاہ ڈال کر دیکھ، تیری نگاہ ذلیل اور تھکی ہوئی تیری طرف لوٹ آئے گی۔

اسلام یہی حکم عملی زندگی کی تمام تشریعی ہدایات میں بھی عطا فرماتا ہے۔ اسلام اعتدال اور میانہ روی کو زندگی کا حسن قرار دیتا ہے، اور اعمال انسانی اسی اعتدال سے مزین ہو کر معاشرے کی تعمیر اور آخرت کی کامیابی کے موجب بنتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس توسط و اعتدال کی وضاحت اپنے

۱۔ الملک: ۳،۲

احوال اور اپنے افعال سے مختلف حوالوں سے فرمائی ہے۔ مشہور واقعہ ہے کہ تین حضرات ازواجِ مطہرات کے پاس آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات عبادت کے بارے میں معلوم کیا، جب اس کی تفصیلات ان کے سامنے رکھی گئیں تو انہوں نے اسے کم جانا اور یہ کہ بیٹھے کہ کہاں ہم اور کہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم۔ اللہ تعالیٰ نے تو آپ کے تمام اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیے ہیں۔ پھر ان میں سے ایک نے تو یہ کہا کہ میں تو رات بھر نماز میں مصروف رہا کروں گا۔ دوسرے نے کہا کہ میں تمام عمر روزے سے رہوں گا، اور کبھی روزہ ترک نہیں کروں گا، اور تیسرا شخص بولا کہ میں کبھی شادی نہیں کروں گا۔ یہ سب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں آیا تو آپ نے ان تینوں صحابہ کے بارے میں فرمایا:

ما بال اقوام قالوا كذا و كذا؟ لكني اصلي و أنام و اصوم و افطر و اتذوج النساء، فمن رغب عن سنتي فليس مني (۲)

لوگوں کو کیا ہو گیا کہ ایسی باتیں کر رہے ہیں، میں تو نماز بھی پڑھتا ہوں، سوتا بھی ہوں، روزہ بھی رکھتا ہوں، روزے کا ناغہ بھی کرتا ہوں اور شادی بھی کرتا ہوں۔ تو جس نے میری سنت سے اعراض کیا وہ مجھ سے نہیں۔

اس واقعے میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے طریقے اور سنت کی وضاحت بھی فرمائی ہے، اور راہِ اعتدال کی عملی تشریح بھی، اور اس کے ساتھ ساتھ اس سلسلے میں جادۂ اعتدال سے ہٹنے والوں کو تنبیہ بھی فرمائی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اس بارے میں اس قدر سختی فرمائی ہے کہ ایک روایت میں فرمایا:

هلك المتنطعون (۳)

اپنے افعال اور اقوال میں حد سے تجاوز کرنے والے ہلاک ہو گئے۔

انسانی زندگی دو حوالوں سے عبارت ہے، ایک اس کا جسمانی وجود، اور دوسری اس کی روحانی قوت۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسان کی رہ نمائی ان دونوں حوالوں سے فرمائی ہے، اور حیاتِ انسانی کے ان دونوں شعبوں میں ایسی تعلیمات عطا فرمائی ہیں، جن پر عمل پیرا ہو کر انسان اپنی روحانی تربیت بھی کر سکتا ہے، اور جسمانی و بدنی تنظیم بھی۔ اس تربیت کے لیے آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ایسے آداب تلقین فرمائے گئے ہیں، جو اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، کمانے کھانے اور رہن سہن کے ہر

۲۔ مسلم۔ الصحیح۔ دار الکتب العلمیہ، بیروت: ج ۲، ص ۳۲۸، رقم ۱۴۰۱

۳۔ مسلم: ج ۴، ص ۲۱۹، ۲۶۷۰

پہلو سے متعلق مکمل احاطہ فرماتے ہیں۔ ان تعلیمات کا خلاصہ یہی نکلتا ہے کہ انسان مزاج کے اعتبار سے اعتدال پر قائم ہو جاتا ہے، پھر نہ تو وہ رہبانیت کی طرف جھکاؤ رکھتا ہے اور نہ خالص مادیت اس کی انسانی تگ و دو کا حاصل اور مقصد حیات ٹھہرتی ہے۔ اسی لیے قرآن حکیم جب روز محشر کفار کی پشیمانی کا نقشہ کھینچتا ہے تو وہ کہتا ہے:

رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ○ ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا وَيُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ○ (۴)

کافر بار بار تمنا کریں گے کہ کاش وہ بھی مسلمان ہوتے۔ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیجئے کہ وہ (خوب) کھالیں اور فائدہ اٹھالیں اور خیالی منصوبے ان کو غفلت میں ڈالے رکھیں بہت جلد ان کو (حقیقت) معلوم ہو جائے گی۔

اسلام کی تعلیمات تو اس قدر واضح ہیں کہ اس مسئلے پر دنیا کا کوئی نظام اور مذہب ایسی دوٹوک ہدایات اپنے دامن میں نہیں رکھتا۔ قرآن کہتا ہے:

وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَا اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِى الْاَرْضِ ط اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ○ (۵)

اور جو کچھ اللہ نے تجھے دیا ہے اس سے آخرت کا گھر حاصل کر اور دنیا سے اپنا حصہ فراموش نہ کر، اور احسان کر جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے، اور ملک میں فساد کا خواہاں نہ بن۔ یقیناً اللہ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا۔

بھلا کیا ان آیات میں کوئی ابہام ہو سکتا ہے جس کی وضاحت یا تفسیر کی ضرورت ہو؟

اسی طرح قرآن حکیم جب کافروں کی بات کرتا ہے تو کھانے پینے کی جانب ان کی غیر فطری اور غیر معمولی رغبت کو بنیاد بناتا ہے۔ ایک مقام پر فرماتا ہے:

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ○ (۶)

اور جو کافر ہیں وہ (دنیا میں کچھ) فائدہ اٹھا رہے ہیں اور وہ اس طرح کھاتے ہیں جس طرح چوپائے کھاتے ہیں اور جہنم ہی ان کا ٹھکانا ہے۔

۴۔ الحجر: ۲، ۳

۵۔ القصص: ۷۷

۶۔ محمد: ۱۲

اس لیے اسلام نے کھانے پینے میں خاص طور پر احتیاط کی تعلیم دی ہے اور خوردن برائے زیستن کا اصول عطا فرمایا ہے۔ کھانا پینا انسانی ضرورت ہے، لیکن ضرورت کو مقصد کا درجہ نہیں دیا جاسکتا، اور اگر یہ غلطی کرلی جائے تو پھر انسان کا حیوانیت کے درجے سے بلند ہونا ممکن نہیں رہتا۔ جب پوری انسانی زندگی کا آزمائش ہے، تو پھر کھانے پینے پر یا اچھا کھانے پینے کے لیے بے تحاشا اور بے محابا کمانے پر انسان کی فکری وعمل صلاحیتوں کا صرف ہونا کیا معنیٰ رکھتا ہے؟

قرآن کہتا ہے:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ و نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ط وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ O (۷)

اور ہم تمہیں ضرور آزمائیں گے، کچھ خوف اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کے نقصان سے اور آپ (ﷺ) صبر کرنے والوں کو خوش خبری سنا دیجئے۔

اس بنا پر رزق میں کمی، کاروباری نقصان، ملازمت میں ترقی کا نہ ہونا، بیماریاں، اپنے پیاروں کا اٹھ جانا سب کچھ اللہ ہی کی جانب سے ہے، اور محض آزمائش ہے۔ یہ نہ سزا ہے، نہ پکڑ ہے، نہ ہمارے اچھے ہونے کی علامت ہے، نہ برے ہونے کی۔ ہمارے اچھے یا برے ہونے کا فیصلہ تو اس آزمائش کے بعد ہوگا۔ یہ تو دنیا میں آنے والے ہر شخص کے لیے مقدر کردیا گیا ہے، اس لیے انعام کے وقت شکر اور کسی مشکل کے وقت صبر ہی انسان کو کامیاب بناتا ہے، اور اخروی زندگی میں سرخ رو کرتا ہے۔ (۸)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی وجہ سے کھانے پینے میں احتیاط کی بھی تعلیم دی ہے اور زیستن برائے خوردن کے رویے کی بھی ممانعت فرمائی ہے۔ ایک روایت میں آپ نے فرمایا:

جو لوگ دنیا میں سب سے زیادہ شکم سیر ہیں، روز آخرت وہی سب سے زیادہ بھوکے ہوں گے۔ (۹)

اس طرح اب یہ بات تشنۂ تحقیق نہیں، بل کہ پوری طرح پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ کثرتِ طعام انسان کے لذت کام ودہن کا بہانہ تو ہے، عملی طور پر چوں کہ یہ غیر فطری ہے، اسی لیے انسان صحت کے لیے سخت مضر ہے۔ اسی تناظر میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان دیکھیے:

۷۔ البقرہ: ۱۵۵

۸۔ سید عزیز الرحمٰن: قرآن کیا کہتا ہے؟۔ کراچی، زوار اکیڈمی پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء: ص ۳۲

۹۔ بزار

ما ملاء آدمی وعاءً شراً من بطن، حسب الآدمی لقیمات یقمن صلبه، فان غلبت الآدمی نفسه فثلث للطعام، وثلث لشراب و ثلث للنفس (۱۰)

انسان کوتو اتنا کھانا کافی ہے، جو اس کی پشت کو سیدھا رکھ سکے۔ اور اگر وہ اس سے زیادہ کھانا ہی چاہتا ہے تو پیٹ کا ایک حصہ کھانے کے لیے، ایک حصہ پینے کے لیے اور ایک حصہ سانس لینے کے لیے (خالی) رکھے۔

یعنی یہ ایسا برتن ہے، جس کا بھرنا اچھی علامت نہیں۔ اس بات کی وضاحت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور واقعے میں تمثیلی انداز میں بھی فرمائی ہے۔ روایت میں آتا ہے کہ ایک کافر ایک بار رسول اکرم ﷺ کا مہمان ہوا تو آپ نے ایک بکری دوہنے کا حکم دیا دودھ نکالا گیا تو مہمان سے پی گیا، پھر دوسری بکری لائی گئی اور اس کا بھی دودھ کافر مہمان پی گیا پھر بھی اسے شکم سیری نہ ہوئی یہاں تک کہ سات بکریوں کا دودھ اکیلے اس کی خوراک بن گیا۔ صبح کو وہ مسلمان ہو گیا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر دودھ دوہنے کا حکم دیا، چناں چہ ایک بکری کا دودھ تو وہ شخص پی گیا لیکن دوسری بکری کا دودھ ختم نہ کر سکا۔ اس پر اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

المومن یا کل فی معی واحد، والکافر یا کل فی سبعة امعاء (۱۱)

مومن ایک معدے میں نوش کرتا ہے جب کہ کافر سات معدوں میں پیتا ہے۔

اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جابر کی ایک اور روایت میں فرمایا:

ایها الناس! اتقوا الله واجملوا فی الطلب، فان نفسا لن تموت حتی تستوفی رزقها، وان ابطا عنها، فاتقوا الله واجملوا فی الطلب، خذوا ما حل، ودعوا ما حرم (۱۲)

اے لوگو! اللہ سے ڈرو اور طلبِ (رزق) میں اعتدال سے کام لو۔ کوئی شخص اس وقت تک نہیں مرے گا جب تک وہ اپنا رزق پورا پورا وصول نہ کر لے، اور اگر کبھی رزق کے حصول میں دیر ہو جائے تو بھی اللہ سے ڈرو، کوشش میں اعتدال سے کام لو، جو رزق حلال ہو اسے لے لو اور جو حرام ہو اسے چھوڑ دو۔

۱۰۔ ابن ماجہ۔ السنن۔ دار المعرفہ، بیروت: ج ۴، ص ۴۲۹، رقم ۳۳۴۹

۱۱۔ مسلم: ج ۳، ص ۳۵۵، رقم ۲۰۶۱

۱۲۔ ابن ماجہ: ج ۳، ص ۷، رقم ۲۱۴۴

یعنی طلب رزقِ حلال عبادت ہے، مگر ضرورت کی حد تک۔ اگر اسے مقصد حیات بنالیا جائے، اور زندہ رہنے کا واحد جواز کمانے اور ہر طرح کمانے میں تلاش کیا جائے تو یہ عمل انسان کو جادۂ اعتدال سے ہٹانے کا باعث بن سکتا ہے۔

اس لیے اسلام دونوں جانب سے اعتدال کی تلقین کرتا ہے، ایک طرف تو وہ کہتا ہے،

طلب کسب الحلال فریضة بعد الفریضة (۱۳)

رزق حلال میں لگنا اور اس کی تگ و دو کرنا یہ (نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج جیسے) فرائض کے بعد ایک فریضہ ہے۔

اگر یہ فرض ادا نہیں ہوگا تو اتنا ہی گناہ ہوگا، جتنا نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ چھوڑنے کا گناہ ہوگا۔ کیوں؟ اس لیے کہ انسان کی ضرورتیں انسان کی پیدائش کے فوراً بعد ہی اس کے ساتھ منسلک کر دی گئی ہیں کہ ان کو بہ ہر صورت پورا کرنا ہے۔ اگر آپ ان ضرورتوں کی تکمیل حلال طریقے سے نہیں کریں گے تو حرام طریقے سے کرائیں گے، لیکن حرام طریقے سے کرنے سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے، تو یقیناً پھر ہمیں حلال طریقے کی طرف جانا چاہیے، جب حلال طریقے کی طرف جانا ہمارے لیے لازمی ہے تو یقیناً یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی پابندی کی جائے گی تو اس میں ہمیں ان شاء اللہ ثواب ملے گا۔ (۱۴)

اور دوسری جانب کمانے میں اعتدال کی تلقین فرماتا ہے، جس کی مثالیں پیش کی جا چکی ہیں۔

اس کائنات میں ایسے نظریات اور خیالات بھی موجود ہیں، جو فطرت کے خلاف عمل ہی کو کامیابی کی شاہ کلید تصور کرتے ہیں، جن کے خیال میں انسانیت کی کامیابی کی راہ لوازم فطرت کے افکار اور فطری تقاضوں کو یک سر مسترد کرنے میں ہے۔ یہ جسم کے مطالبات کو کچل کر راحت تلاش کرتے ہیں، یہ روح کو جسم کے مقابل رکھ کر سوچتے ہیں۔ اور ان کے خیال میں روح اسی وقت تک اپنے کمال کو نہیں پہنچ سکتی، جب تک وہ جسم کے بندھنوں اور اس کے تقاضوں سے مکمل طور پر آزاد نہ ہو جائے۔ یہی وہ رخنہ ہے، جس سے رہبانیت انسانی زندگی میں داخل ہوتی ہے۔ اسلام سے اس تصور کا دور کا بھی علاقہ نہیں۔

رہبانیت انسانی فطرت سے بے اعتنائی اور اس سے جنگ کا نام ہے، جو صلاحیت اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش کا حصہ بنادی ہے، اس سے لڑنا کیسے مفید ہو سکتا ہے؟ اسی لیے اسلام انسانی فطرت سے

۱۳۔ طبرانی، المعجم الکبیر۔ موصل، مکتبۃ العلوم والحکم ۱۹۸۳ء: ج ۱۰، ص ۷۴

۱۴۔ قرآن کیا کہتا ہے؟: ص ۲۴، ۲۵

لڑنے کی بہ جائے اس کا حق ادا کرنے اور اس راستے میں اعتدال سے کام لینے کی تلقین کرتا ہے، اسی لیے قرآن کہتا ہے کہ رہبانیت عیسائیت کی اپنی اختیار کردہ راہ ہے، فرمایا:

وَرَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ O (۱۵)

اور رہبانیت انہوں نے خود ایجاد کی تھی، ہم نے ان پر واجب نہیں کی تھی، لیکن انہوں نے رضائے الٰہی کے لئے اس کو اختیار کیا تھا۔ سو انہوں نے اس کی پوری رعایت نہ کی۔ پھر بھی ہم نے ان میں سے ایمانداروں کو اُن کا اجر دیا اور اُن میں سے اکثر نافرمان ہیں۔

رہبانیت کی مثالیں ہمیں عیسائیت کے ساتھ ساتھ ہندومت میں مل سکتی ہیں۔ دونوں جگہ اس نے برائیوں کے سوا معاشرے کو کچھ نہیں دیا۔ دونوں مقام پر نامکمل انسان انسانی فطرت سے جنگ کرتے اور معاشرے کو برائیوں میں مبتلا کرتے نظر آتے ہیں، جس کے لیے تاریخ کی گواہی اور مشاہدے کا شعور کافی ہے۔ کسی مثال کی ضرورت نہیں۔ (۱۶)

اسراف وتبذیر

کمانے کے بعد خرچ کرنے کا مرحلہ آتا ہے، ہر مذہب، مسلک اور نظام میں کمانے کے کچھ نہ کچھ آداب مقرر ہیں، اپنے آپ کو آسمانی ہدایت سے یک سر آزاد قرار دینے والے معاشرے بھی اس سلسلے میں ایک نظام پر یقین ضرور رکھتے ہیں، اور اسی کے دائرے میں رہتے ہوئے دولت کمانے اور مادیت کی تگ و دو میں مصروف عمل رہتے ہیں، لیکن کمانے کے بعد خرچ کیسے کیا جائے؟ اس بارے میں اسلام کے علاوہ تمام مذاہب اور تمام نظام ہائے حیات خاموش ہیں۔ ہر ایک کی نگاہ میں اگر میری کمائی ہوئی دولت ان کے نظام کے مطابق جائز طریقوں سے حاصل شدہ ہے، تو اب کسی کو اس بابت مجھ سے پوچھنے کا حق نہیں کہ میں اسے خرچ کہاں اور کس طرح کرتا ہوں۔ اس باب میں صرف اسلام کا استثنا ہے۔

اسلام نے اس حوالے سے مکمل وضاحت کے ساتھ ایک نظام قائم کیا ہے، جس کی بنیاد ان دو اصطلاحات پر ہے، اسراف اور تبذیر۔

اسراف کی تعریف راغب اصفہانی اس طرح کرتے ہیں:

۱۵۔ الحدید: ۲۷

۱۶۔ قرآن کیا کہتا ہے: ص ۲۶

السرف تجاوز الحد فی کل فعل یفعله الانسان (۱۷)

لغت میں ہر انسانی فعل میں حد سے تجاوز کرنے کو اسراف کہتے ہیں۔

اور سفیان بن عیینہ اسراف کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ما انفقت فی غیر طاعة الله سرف، وان کان قلیلاً (۱۸)

اللہ کی اطاعت کے کاموں کے علاوہ جو کچھ بھی تم خرچ کرو گے وہ اسراف ہے، خواہ وہ تھوڑا ہی کیوں نہ ہو۔

تقریباً یہی تعریف ابن منظور سے لسان العرب میں منقول ہے۔(۱۹)

مناوی سے اسراف کی اصطلاحی تعریف اس طرح منقول ہے:

الاسراف هو الابعاد فی مجاوزة الحد (۲۰)

اسراف حد سے تجاوز کرنے کو کہتے ہیں۔

جرجانی نے اسراف کی یہ تعریف کی ہے:

هو ان یاکل الرجل مالایحل له او یاکل ممایحل له فوق الاعتدال ومقدار الحاجة (۲۱)

اسراف یہ ہے کہ انسان وہ کچھ کھائے جو اس کے لیے حلال نہیں یا حلال تو ہے مگر وہ اعتدال اور ضرورت سے زیادہ کھائے۔

جب کہ اس سلسلے کی دوسری اصطلاح تبذیر ہے۔ تبذیر لغت میں کسی چیز کو پھینکنے اور منتشر کرنے کو کہتے ہیں۔(۲۲)

تبذیر کی اصطلاحی تعریف امام شافعی سے اس طرح منقول ہے:

التبذیر انفاق المال فی غیر حقه، ولاتبذیر فی عمل الخیر (۲۳)

۱۷۔ المفردات: ص ۲۳

۱۸۔ موسوعۃ نضرۃ النعیم: ص ۳۸۸۴

۱۹۔ لسان العرب بہ ذیل مادہ سرف

۲۰۔ نضرۃ النعیم: ص ۳۸۸۵

۲۱۔ ایضاً

۲۲۔ نضرۃ النعیم: ۴۱۱۳

۲۳۔ تفسیر قرطبی: ج ۱، ص ۲۴۷

تبذیر نا جائز کام میں خرچ کرنے کو کہتے ہیں۔ نیک کام میں تبذیر نہیں ہوتی۔

قرطبی کہتے ہیں:

هو النفقة فی غیر وجوه البر التی یتقرب بها الی الله تعالیٰ (۲۴)

تبذیر سے مراد نیک کاموں کے سوا کسی ایسے کام میں خرچ کرنا ہے جس سے مقصد اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا نہ ہو۔

مجاہد کہتے ہیں کہ اگر انسان اپنا سارا مال حق کے راستے میں خرچ کر دے تو یہ تبذیر نہیں اور اگر وہ گناہ کے کام میں ایک مد یعنی ایک سیر غلہ بھی خرچ کرے تو یہ تبذیر ہے۔ (۲۵)

قتادہ کہتے ہیں کہ تبذیر اللہ کی نافرمانی اور ناحق اور فساد کے لیے خرچ کرنے کا نام ہے۔ (۲۶)

اور اسراف و تبذیر میں باہمی فرق واضح کرتے ہوئے کفوی کہتے ہیں:

الاسراف هو صرف فیما لاینبغی زائدا علی ماینبغی، اما التبذیر فانه صرف الشئ فیما لاینبغی (۲۷)

اسراف تو کسی جائز کام میں ضرورت سے زیادہ خرچ کرنے کو کہتے ہیں اور تبذیر نا جائز کام میں خرچ کرنے کو کہتے ہیں۔

اسراف کی وضاحت کے حوالے سے ایک نہایت اہم روایت ذخیرۂ حدیث میں ہمیں اور ملتی ہے، عمرو بن شعیب اپنے باپ اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں محتاج ہوں، میرے پاس کچھ نہیں ہے اور میں ایک یتیم کا سرپرست ہوں۔ آپ نے فرمایا:

کل من مال یتیمك غیر مسرف ولا مباذر ولا متاثل (۲۸)

اپنے یتیم کے مال میں سے کھا، اسراف اور فضول خرچی اور اس کے مال سے پونجی بنائے بغیر۔

۲۴۔ نضرۃ النعیم: ص ۴۱۱۴

۲۵۔ صفوۃ التفاسیر: ج ۲، ص ۱۳۹

۲۶۔ ایضاً: ج ۲، ص ۱۳۹

۲۷۔ نضرۃ النعیم: ص ۴۱۱۴

۲۸۔ ابوداؤد: ج ۳، ص ۳۶، رقم ۲۸۷۲۔ نسائی: کتاب الوصایا باب ماللوصی من مال الیتیم اذا قام علیہ

یہاں سبق آموز بات یہ ہے کہ یتیم کی کفالت جہاں اسلام میں ایک نہایت اہم فریضہ اور باعث اجر کام ہے، وہیں اس سلسلے میں بھی فضول خرچی یعنی اسراف سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔ یعنی اعتدال اور توازن کا دامن ہر صورت میں تھامنا ضروری ہے۔

آپ ﷺ کی ذات گرامی نے اس سلسلے میں بھی اپنی امت کے لیے بہترین نمونہ عمل چھوڑا ہے۔ آپ نے ہمیشہ سادہ زندگی بسر کی اور فقر وفاقے کی حالت میں نہایت صبر وشکر سے اپنے فرائض منصبی ادا کئے، باوجود اس کے کہ آپ ﷺ کو تمام سہولتیں میسر آسکتی تھیں۔ یوں آپ کا فقر اختیاری تھا۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں:

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يبيت الليالى المتتابعة طاويا واهله لايجدون عشاء وكان اكثر خبزهم خبز الشعير (۲۹)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے گھر والے کئی کئی رات خالی پیٹ سوتے تھے، کیوں کہ رات کو کھانے کے لیے کچھ نہیں ہوتا تھا۔ اور ان لوگوں کی خوراک اکثر جو کی روٹی ہوتی تھی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کے قیام کے دوران وفات تک کبھی دو وقت سیر ہو کر روٹی نہیں کھائی۔ (۳۰)

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جوڑا کبھی تہہ کر کے نہیں رکھا گیا کیوں کہ آپ کا دوسرا جوڑا ہوتا ہی نہ تھا جو تہہ کر کے رکھا جاتا۔ (۳۱)

آپ ﷺ نے معاشرتی میں اونچ نیچ ختم کرنے پر بھی زور دیا ہے، اور مساوات واعتدال کا درس دیا ہے۔ جاہ ومال کی غیر ضروری نمائش کا واحد مقصد اپنی برتری کا اظہار ہوتا ہے، اور اس قسم کی منفی سوچ معاشرے کی وحدت اور اجتماعیت کو فوت کر کے اتحاد واتفاق پر مبنی معاشرے کی تباہی کا سبب بن جاتی ہے۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آرائش پر تو پابندی عائد نہیں کی لیکن نمائش کو قطعاً ممنوع قرار دیا ہے، اور ہر معاملے میں مساوات کا درس دیا ہے، تاکہ معاشرتی وقار نمائش پسندوں کا شکار نہ ہو سکے۔ چناں چہ عبادت وریاضت، کھانے پینے، سونے جاگنے، اٹھنے بیٹھنے، ملنے جلنے اور رہنے سہنے سے لے کر لباس ومکان تک ہر مقام پر آپ ﷺ کی ارشادات اعتدال کا درس دیتے نظر آتے ہیں، اور

۲۹۔ ترمذی: ج ۴، ص ۱۶۰، رقم ایضاً ۲۳۶۷

۳۰۔ الشفا: ج ۱، ص ۸۲

۳۱۔ ایضاً

اگر ہر معاملے میں اعتدال ومیانہ روی کو اختیا کرلیا جائے تو معاشرتی وحدت اور مساوات خود بہ خود قائم ہوسکتی ہے۔

انسان نمائش کی ابتدا عموماً اپنے لباس سے کرتا ہے۔ آپ ﷺ نے اس بارے میں اعتدال پر مبنی ہدایات فرمائیں۔ آپ ﷺ نے جہاں ایک طرف غربا وفقرا کو ان کے لباس سے قطع نظر ان کے باطنی حالات کے پیش نظر قبولیت کی سند عطا فرمائی، وہیں مالدار افراد کو بھی حیثیت کے مطابق زندگی بسر کرنے کا حکم دیا، تاکہ افراط وتفریط کے مابین توازن قائم ہوسکے اور اعتدال کا قیام عمل میں آسکے۔ چناں چہ آپ ﷺ نے فرمایا:

کتنے ہی پراگندہ حال چیتھڑوں میں ملبوس انسان ایسے ہوتے ہیں کہ اگر وہ اللہ کی قسم کھالیں تو اللہ تعالیٰ اس کو پورا کرتے ہیں۔(۳۲)

اور خود آپ ﷺ نے کس حالت میں زندگی بسر کی؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی گواہی ملاحظہ ہو۔ ابو بردہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے پیوندلگی ہوئی چادر اور ایک یمن کی بنی ہوئی لنگی پیش کی اور خدا کی قسم کھا کر کہا کہ اللہ کے رسول نے انہی دو کپڑوں میں اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کی تھی۔(۳۳)

دوسری جانب آپ ﷺ نے مال دار افراد کو تلقین کی:

اگر کوئی شخص خوش حال ہے تو کیا حرج ہے کہ اگر وہ کام کاج کے دو کپڑوں کے علاوہ جمعہ کے دن کے لئے بھی دو کپڑے رکھے۔(۳۴)

اسی طرح ایک شخص کو میلے کچیلے لباس میں دیکھا تو فرمایا کہ اس سے اتنا نہیں ہوتا کہ کپڑے دھولیا کرے۔(۳۵)

ایک شخص آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس کے بدن پر پھٹا پرانا لباس تھا۔ آپ نے اس سے پوچھا کہ کیا تمہارے پاس مال ہے؟ اس نے کہا جی ہاں، آپ ﷺ نے فرمایا، کس قسم کا ہے؟ اس نے

۳۲۔ ترمذی: ج۵ص۴۵۹، رقم ۳۸۸۰

۳۳۔ بخاری: ج۴، ص۲۱۔ ابن ماجہ: ج۴، ص۴۸۷، رقم ۳۵۵۰

۳۴۔ ابوداؤد: ج۴، ص۴۰۵، رقم ۱۰۷۸

۳۵۔ ابوداؤد: ج۴، ص۱۶، رقم ۴۰۶۲

۳۶۔ ابوداؤد: ج۴، ص۱۶، رقم ۴۰۶۳

جواب دیا کہ اللہ نے مجھے ہر قسم کے مال سے نواز رکھا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

جب اللہ نے تجھے مال دے رکھا ہے تو اللہ کی نعمت اور سخاوت کا اثر بھی ظاہر کر۔ (۳۶)

لیکن اسلام نے خوش پوشاکی کی حد سے گزر کر اسراف کی حدود میں داخل ہو جانے والی آرائش کی سختی سے ممانعت کی ہے جو دراصل نمائش اور دکھلاوے کی خاطر کی جاتی ہے، کیوں کہ یہ راہ اعتدال سے ہٹ کر ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے، فرمایا:

جس نے دنیا میں شہرت کا لباس زیب تن کیا اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن ذلت کا لباس پہنائے گا اور اس میں آگ بھڑکائے گا۔ (۳۷)

زیورات خواتین کی فطری خواہش ہیں۔ آپ ﷺ نے اس فطری تقاضے پر پابندی عائد نہیں کی، البتہ افراط سے وہاں بھی منع فرمایا۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی بہن سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اے عورتو! کیا زیور بنانے کے لئے تمہارے لئے چاندی کافی نہیں ہے؟ خبردار! جو عورت بھی سونے کا زیور بنائے گی اور اس کے ذریعے زینت کا اظہار کرے گی اسے اسی زیور سے عذاب دیا جائے گا۔ (۳۸)

یہ وعید ان عورتوں کے لئے ہے جو زیورات کی دیوانی ہوتی ہیں اور جو رنگ و نور کے سیلاب میں کھو کر فرائض اور حقوق سے غافل ہو جاتی ہیں۔

مال دار حضرات کا سب سے زیادہ زور تعمیرات میں صرف ہوتا ہے، اور اس موقع پر عموماً حد اعتدال کو برقرار نہیں رکھا جاتا، اس کا ایک مقصد نمائش کے علاوہ عیش کوشی اور آرام طلبی ہوتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پہلو کو بھی تشنہ نہیں چھوڑا۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کی جانب گورنر بنا کر روانہ فرمایا تو یہ نصیحت بھی کی:

عیش کوشی سے دور رہنا، کیونکہ اللہ کے بندے آرام طلب نہیں ہوتے۔ (۳۹)

یہی وجہ تھی کہ آپ ﷺ نے سونے اور چاندی کے برتنوں میں کھانا پینا حرام فرما دیا اور مردوں کے لئے حریر و ریشم کے استعمال کو ممنوع قرار دیا۔

۳۷۔ ابن ماجہ: ج ۳، ص ۵۰۳، رقم ۳۶۰۷

۳۸۔ ابوداؤد: ج ۴، ص ۷۰، رقم ۴۲۳۷

۳۹۔ احمد: ج ۵، ص ۲۴۴

اس پوری بحث کو ایک حدیث میں یوں مختصراً بیان کیا گیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

میری امت میں ایسے لوگ آئیں گے جو رنگ برنگ کے کھانے کھائیں گے، انواع واقسام کے مشروبات استعمال کریں گے اور طرح طرح کے لباس زیب تن کریں گے اور منہ پھاڑ پھاڑ کر باتیں بنائیں گے، یہی لوگ میری امت کے بدترین افراد ہوں گے۔ (۴۰)

خود آپ ﷺ نے عملی طور پر اسلامی حکومت کے قیام کے بعد مساوات کا وہ عظیم الشان نمونہ پیش فرمایا کہ تاریخ اس کی نظیر پیش کرنے سے آج بھی قاصر ہے۔ آپ ﷺ کے اور صحابہ کرام کے مابین لباس کے اعتبار سے بھی کوئی فرق موجود نہ تھا۔ اسی طرح آپ ﷺ کی نشست بھی ایسی عام اور کسی امتیاز کے بغیر ہوتی تھی کہ باہر سے آنے والے شخص کو آپ کے بارے میں پوچھنا پڑتا تھا۔ صحابہ کرام نے آپ کے بیٹھنے کے لئے ایک چبوترا بنانا چاہا تو آپ ﷺ نے اس کو بھی پسند نہ فرمایا۔ (۴۱)

اور اعتدال اور توازن کا حکم صرف کھانے پینے، کمانے اور معاشرتی امور تک محدود نہیں ہے۔ یہ حکم انسانی زندگی کے ہر ہر پہلو سے تعلق رکھتا ہے، چناں چہ دین کے معاملے میں بھی غلو سے بچنے کا حکم براہ راست قرآن کریم میں دیا گیا، اور یہاں غلو سے مراد بھی حد سے بڑھنا ہے۔ دین کے معاملے میں غلو اور حدود سے تجاوز کرنا سخت ناپسندیدہ ہے، قرآنِ کریم میں فرمایا گیا:

لَاتَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ (۴۲)

تم اپنے دین کے معاملے میں غلو نہ کرو۔

یہاں غلو سے مراد حد سے تجاوز کرنا ہے (۴۳) اس غلو کا نتیجہ بھی شدت پسندی اور انتہا پسندی کی صورت میں نکلتا ہے، اور جو لوگ غلو سے دوچار ہوجاتے ہیں وہ پھر اعتدال سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس لئے اس سے بھی شریعت نے منع فرمایا۔ حدیث میں فرمایا گیا:

ایاکم والغلو فی الدین فانما ھلك من کان قبلکم بالغلو فی الدین (۴۴)

۴۰۔ المعجم الکبیر: ج۱، ص۱۰۷

۴۱۔ سید عزیز الرحمٰن۔ تعلیمات نبوی اور آج کے زندہ مسائل۔ القلم۔ فرحان ٹیرس، ناظم آباد نمبر۲، کراچی، مئی ۲۰۰۵ء:.....

۴۲۔ النساء: ۱۷۱

۴۳۔ جلالین: ص۳۳

۴۴۔ ابوداؤد: ج۴، ص۲۹۹، رقم ۴۹۰۴

تم دین میں غلو سے بچو، کیوں کہ، پچھلی امتیں دین میں غلو کی وجہ سے ہلاک ہوگئیں۔

اسی طرح شدت پسندی بھی عدم توازن کی علامت ہے، اعتدال اور توازن پر کار بند شخص کسی حوالے سے شدت پسند نہیں ہوسکتا۔ قرآن وسنت کی پوری تعلیمات اور اسوۂ حسنہ کا پیغام اسی کے گرد گھومتا ہے۔ اسی لیے شدت پسندی خواہ کسی معاملے میں ہو، انسان کو نقصان پہنچاتی ہے، اسی بنا پر اسلام نے دین کے معاملے میں بھی اس سے بچنے کی تاکید کی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا تشددوا علی انفسکم فیشدد علیکم فان قوما شددوا علی انفسهم فشدد الله علیهم، فتلك بقایاهم فی الصوامع والدیار (۴۵)

تم اپنے آپ پر سختی نہ کرو ورنہ تمہارے اوپر سختی کی جائے گی، کیوں کہ ایک قوم نے اپنے آپ پر سختی کی، پھر اللہ نے بھی ان پر سختی کی، تو ان ہی لوگوں کے باقیات ہیں جو گرجوں اور خانقاہوں میں نظر آتی ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ حسن اعتدال اور توازن ہی حیات انسانی کا حسن ہے، اور اسی کے ذریعے ہماری دنیاوی زندگی کامیابی سے بسر ہوسکتی ہے، جس پر ہماری اخروی دائمی زندگی کا مدار اور انحصار ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں دین کی صحیح سمجھ عطا فرمائے، اور اس پر عمل کی توفیق ارزانی فرمائے۔ آمین

نوٹ: السیرہ کے شمارہ ۳۲، بابت رمضان المبارک ۱۴۳۵ھ کا اداریہ بہ عنوان حقوق نبوی صلی اللہ علیہ وسلم نائب مدیر السیرہ کے قلم سے تھا، فہرست میں غلطی سے مدیر کا اندراج ہوگیا تھا۔ تصحیح فرمالیں۔ ادارہ

۴۵۔ ابوداؤد: ج ۴، ص ۲۹۹، رقم ۴۹۰۴